ہلاکت اور شہادت

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

یہ مضمون درحقیقت سرکار سید العلماء مدظلہٗ کی اس معرکہ آرا تقریر کا خلاصہ ہے جو یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال، لکھنؤ میں اس موضوع پر ہوئی تھی کہ ''ہلاکت اور شہادت کا فرق واقعۂ کربلا کی روشنی میں''۔
اسے بروقت امامیہ مشن کے رفیق کار جناب ایم۔ایم۔ غلام حسین صاحب نے قلم بند کیا تھا جس کے لئے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔(ابن حسین نقوی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید المرسلین و آلہ الطاھرین۔

انسان کی زندگی کن مقاصد سے وابستہ ہے جب تک اس کا تعین نہ ہو، اس وقت تک انسان کی قربانی کا صحیح مصرف متعیّن نہیں ہوسکتا اور ظاہر ہے کہ جتنا مقصد بلند ہو اتنی شئے میں بلندی اور جتنا مقصد پست ہو اتنی پستی ہوتی ہے۔

دنیا میں مختلف پیشے اور کاروبار ہیں۔ ہر ایک کا درجہ اس کے مقصد کے لحاظ سے ہے۔ معمار کا کام عمارت بنانا اور معلم کا کام علوم کی تدریس کرنا ہے۔ پہلے کا تعلق اینٹ گارے سے ہے، اس کا مقصد پست ہے، اس لئے تمام عقلاء کے نزدیک اس کا درجہ پست، اور دوسرے کا کام علم کے جوہر سے آراستہ کرنا ہے، اس کا تعلق جوہرِ روح کے ساتھ ہے جس کا درجہ بلند ہے، اس لئے خود اس کام کا درجہ بلند ہے۔

چونکہ مقصد خود ذریعہ سے اہم ہوتا ہے اس لئے ہمیشہ مقصد سے ذریعہ پست ہوتا ہے اس لئے اگر کسی نے زندگی کا مقصد نیچا رکھا ہے تو زندگی نیچے آئے گی اور اگر مقصد بلند رکھا ہے تو زندگی میں بلندی پیدا ہوگی۔

انسان نے عالمِ مشاہدہ میں کائنات کی چیزوں پر نظر کی۔ پہاڑوں کی بلندی کو دیکھا، سمجھا کہ یہ مجھ سے مافوق ہیں۔ اونچے اونچے درختوں کو دیکھا تو اپنے کو نارسا سمجھا۔ حیوان کے ساتھ بہت سی اپنی ضرورتوں کو وابستہ دیکھا تو اپنے کو ان کا مرہونِ احسان سمجھ لیا۔ اس طرح اس میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا گیا اور وہ اپنے کو سب سے پست سمجھ گیا۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ یہ ان میں سے کسی کے استعمال کا حق نہیں رکھتا بلکہ وہ خود ان میں سے ہر شئے کی خدمت کرنے کے لئے رہ گیا۔ اسے اب تو پوری زندگی ان سب کی پوجا میں صرف کردینا چاہئے۔ اس طرح اس کی نگاہ پست ہوگئی اور نگاہ کے ساتھ معیارِ اخلاق پست ہوا۔ بلندیٔ اخلاق کے لئے ضرورت ہے کہ انسان کو اس کا صحیح درجہ بتایا جائے اس طرح اس کے مقاصدِ حیات بلند ہوں گے اور پھر اس کی زندگی بھی بلند ہوجائے گی۔

اس کے لئے قرآنِ کریم نے افرادِ انسانی کو آواز دے کر بتایا: ''**خلق لکم ما فی الارض جمیعا**'' کارگاہ عالم میں جتنی کائنات ہے وہ سب تمہارے لئے ہے۔''

پہاڑ کتنے ہی بڑے ہوں، درخت کتنے ہی بلند ہوں، حیوان کتنے ہی خیر و برکت کا سرچشمہ ہو، تصرّف کا حق ان سب میں تم کو ہے۔

اب جب تمام کائنات انسان کے لئے ہوگئی تو

اسے احساس بلندی ہونا چاہئے۔ اب اس کا مقتضا یہ ہے کہ یہ پہاڑوں، درختوں اور حیوانات کے آگے نہ جھکے۔ یہ لا الہ کی منزل ہے۔ یہاں پر تمام کائنات سے معبود ہونے کی نفی ہوجاتی ہے۔

یہاں تک انسان پہنچ گیا، اب انسان سے مافوقِ ہستی کا اگر تصوّر نہ ہوا تو زندگی بے مقصد ہوگی اور غلط مقصد میں صرف ہونے والی زندگی ہی کی طرح اخلاقی طور پر بے مقصد زندگی بھی پست ہوگی۔

اپنے ہی کو اپنا مقصد اگر بنالیا تو بے کاری، تن آسانی اور سہولت پسندی کی زندگی بسر ہوگی۔ اس کا نظریہ یہ ہوگا کہ عیش کرو، مزے سے زندگی بسر کرو اور ممکن سے ممکن آرام اور ہر طرح کے لذائذ نفس حاصل کرو، کیونکہ جو کچھ بھی ہو بس تم ہی ہو۔

اب اس نصب العین کی صورت میں تصادم بھی ناگزیر ہے کیونکہ مادرِ فطرت کے بطن سے کوئی ایک ہی فرد تو پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ افرادِ انسانی بکثرت ہیں۔ اب اگر نوعِ انسانی میں سے ہر فرد نے اپنے لطف اور لذّتِ نفس ہی کو نصب العین قرار دے لیا تو ہر ایک کے جینے کی راہ میں دوسرے کی زندگی حائل ہوگی۔ اس طرح کوشش ہوگی کہ دوسرے کی زندگی سے اپنی زندگی کو مقدم سمجھا جائے اور اس کا نتیجہ یہی ہے کہ قوی ضعیف کو اور دولت مند غریب کو کھا جائے۔ اپنے کو اپنا مقصد بنالینے کا تقاضائے عقلی یہی ہے کہ جو شخص اپنی ذات کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اسے پہنچانا چاہئے اور جو نہیں فائدہ پہنچا سکتا وہ بدقسمت ہے اور اسے استحقاقِ حیات ہی نہیں ہے۔ اسی سے ''طاقت حق ہے'' کا نظریہ قائم ہوتا ہے۔

اس ذہنیت کا علاج صرف یہ ہے کہ اس انسان کو اس سے مافوقِ قوت کا تصوّر قائم کرایا جائے اور وہ قوت بھی ایسی جو تمام نوعِ انسانی سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ اب جب اس کی رضاجوئی مطلوب ہوگی جو تمام کائنات کا پروردگار ہے تو دوسرے کی زندگی کو بھی اپنی ہی زندگی کی طرح عزیز رکھنا ہوگا۔ اسی تصوّر کے لئے لا الہ کے بعد الّا اللہ کی منزل پر پہنچنا لازم ہے۔

اب سلسلہ یوں مرتّب ہوگیا کہ ما سوائے انسان سب انسان کے لئے اور خود انسان خالقِ انسان کے لئے۔ پہلے جزو کو قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ **''خلق لکم ما فی الارض جمیعا''** تمہارے لئے سب کو خلق کیا۔ اور دوسرے جزو کو کبھی ان لفظوں میں کہ **''ما خلقت الجنّ و الانسن الّا لیعبدون''** جن و انس کی خلقت اس لئے ہے کہ وہ میری رضا جوئی کریں، اور کبھی اس طرح کہ **''قل انّ صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین''**۔

تمہارا قول یہ ہونا چاہئے۔ لفظیں نہیں بلکہ مقولہ نظریہ اور اصول کے معنی میں۔ یعنی تمہارا اصول زندگی یہ ہونا چاہئے کہ میری زندگی اور موت سب اللہ کے لئے ہے۔ اب جب اللہ کے لئے ہے تو اللہ کے کام میں صرف ہونا چاہئے مگر اللہ کا کام خود اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ غنی مطلق ہے بلکہ یہ کام اس کی مخلوق ہی سے وابستہ ہوگا۔ ان سب کا مفاد جن کا اللہ سے رشتہ ہے اللہ کا کام ہوگا۔ اسی لئے **محیای و مماتی للہ** کہنے کے بعد **رب العالمین** کی لفظ کہی گئی۔ یعنی اللہ کا وصف یہ بیان کیا گیا کہ وہ تمام عالمین کا پروردگار ہے اور اس طرح ہمہ گیر طور پر حقوقِ انسانی کے تحفظ کے لئے قربانی کا تصوّر پیدا کیا۔

بے شک کچھ فرقوں نے ایسا خیال قائم کرلیا تھا کہ اللہ ہمارا ہے اور کسی کا نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ **''نحن ابنآء اللّٰہ و احبآؤہ''** ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو تعلیم دی گئی کہ وہ کہیں **هو ربّنا و ربّکم لنا اعمالنا و لکم اعمالکم**۔ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے، تمہارا بھی پروردگار ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' اسی وسعت کو رب العالمین کی لفظ سے ظاہر کیا گیا کہ وہ ''تمام جہانوں کا پروردگار'' ہے اس صورت میں اس کے مقاصد بھی محدود نہیں ہوسکتے۔ اس کو ہر ایک کا فائدہ مدنظر ہوگا۔ اب اگر انسان نے خالق کی رضا کے لئے اس کے مخلوق کو کوئی اہم فائدہ

پہنچانے میں جان دے دی تو یہ اس کی راہ میں قربانی قرار پائے گی۔

انسان کی زندگی فقط اپنے لئے ہوتی تو ایثار اور قربانی کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا جیسا کہ موجودہ زمانے میں ''روٹی'' کا نعرہ شدّت سے لگایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جیتے جی کون ہوگا جو روٹی کی اہمیت سے انکار کرے مگر یاد رہے کہ روٹی کی اہمیت ذریعۂ حیات کی حد تک ہے اور صاف بات ہے کہ مقصد ذریعہ سے اشرف ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روٹی کی اہمیت سے زیادہ خود حیات کی اہمیت ہے۔ اب اگر ہماری حیات کا بھی کوئی مقصد ہے تو وہ مقصد خود حیات سے زیادہ مقدم ہوگا۔ پھر روٹی سے مقدم کیوں کر نہ ہوگا لہٰذا روٹی کی اہمیت ضرور ہے مگر اس حد تک کہ مقصدِ حیات کو نقصان نہ پہنچے لیکن اگر روٹی کا حصول مقصدِ حیات کے پامال کر دینے سے وابستہ ہو جائے تو وہ روٹی کا خیال ترک کر دینے کے قابل ہے۔ اکلِ حلال اور اکلِ حرام کی تفریق یہیں سے پیدا ہوئی ہے۔ کون ذریعۂ معاش حلال ہے اور کون ذریعۂ معاش حرام؟ ایک مزدور سر کا پسینہ ایڑی تک بہا کر بھی روٹی کھاتا ہے اور ایک چور اور ڈاکو بھی محنت سے روٹی حاصل کرتا ہے مگر وہ روٹی مقصدِ حیات کے ساتھ سازگار ہے اور یہ نہیں ہے، اس لئے وہ حلال ہے اور یہ حرام۔

اگر روٹی، زندگی اور مقصدِ زندگی، ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر رہے تو روٹی والے نظام اور مذہب سے کسی اصولی تصادم کا سوال پیدا نہ ہو۔

''خوردن برائے زیستن'' بالکل درست ہے مگر ''زیستن برائے چہ؟'' بھی ایک مستقل سوال ہے۔ دنیا کا کوئی بھی اقتصادی نظام ہو وہ پہلے ہی مرحلہ کی تنظیم کرتا ہے اور مذہب دوسرے مرحلہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

وہ غذا جس کے کھانے سے آدمی مر جائے گا، ہے تو وہ بھی روٹی مگر چونکہ ذریعہ ہونے کے بجائے مفنیٔ حیات ہے اسی لئے نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ اسی طرح بدرجۂ اولیٰ وہ روٹی جو مقاصدِ حیات کے لئے تباہ کن ہو نظر انداز کرنے کی مستحق ہوگی۔

ضبطِ نفس، صبر و تحمل، قناعت، ایثار اور قربانی کا سنگِ بنیاد یہی تفریق ہے کہ کچھ چیزیں انسان کی خاطر ہیں اور کوئی چیز وہ ہوتی ہے جس کی خاطر انسان ہے۔ جب انسان ان مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی یا زندگی سے وابستہ کسی چیز کو تج دیتا ہے تو اس کا نام ہوتا ہے قربانی اور اسی زندگی سے ہاتھ دھونے کا نام ہوتا ہے ''شہادت''۔

اس طرح قربان ہونے والا ظاہر میں فنا ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ زندگی جاوید حاصل کرتا ہے اور یہ انسان سے مخصوص نہیں بلکہ تمام نظامِ کائنات اسی قربانی پر قائم ہے۔

زمین جمادات میں داخل ہے، بے جان چیز ہے مگر یہ زمین دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک کو کہتے ہیں زمینِ مردہ اور دوسری کو زمینِ زندہ۔ مردہ زمین وہ او سر یا بنجر زمین ہے جس میں نباتات کے روئیدہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور زمین زندہ وہ ہے جس میں نشو و نما کی طاقت ہو، تھوڑے سے بیج بوئے اور ان سے ایک ایسا سایہ دار درخت ہو گیا جو ایک قافلہ کو اپنی چھاؤں میں پناہ دے سکتا ہے اور تھوڑے سے دانے سپردِ زمین کئے اور ان سے ایک لہلہاتا ہوا کھیت ہو گیا جو ایک خاندان کی پرورش کر سکتا ہے۔

اس نشو و نما کا راز کیا ہے؟ اس کے متعلق چھان بین کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود زمین میں قدرت نے ایسے اجزاء ودیعت کئے ہیں جو اپنے سے مافوق یعنی نباتات کے جزو بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، زمین ان اجزاء کو امانت داری کے ساتھ محفوظ رکھتی ہے کسی حق دار کے آنے کے انتظار میں۔ جب وہ حقدار آجاتا ہے تو زمین ان اجزاء کو اس کی خاطر نذر کر دیتی ہے۔ پھر کچھ فیض ہوا سے کچھ فیض آب سے اور کچھ فیض آفتاب سے اجزاء شریک ہوتے جاتے ہیں مگر بنیادی اجزاء وہی ہیں جو زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب یہ زمین کے ذرّات اپنے حدودِ وجود میں فنا ہو گئے بایں معنیٰ کہ خاک میں وہ نہ رہ گئے لیکن یہ فنا بلند تر بقاء کا ذریعہ ہوئی۔ وہ زمین مردہ ہے جس میں اس قربانی کی صلاحیت

نہ ہو اور وہ زمین زندہ ہے جس میں اس ارتقاء کی گنجائش ہو۔

اس کے بعد یہ درختوں کے پتّے، یہ سبزہ، یہ پھل پھول کیا چھوڑ دیئے جائیں تو یوں ہی باقی رہیں گے؟ کبھی نہیں۔ تمازتِ آفتاب، بادِ سموم اور کچھ نہ ہو تو امتدادِ زمانہ سے ختم ہو جائیں گے اور ان صورتوں سے ختم ہوں تو خاتمہ ہی ہے لیکن اگر کسی جاندار کی غذا بن جائیں تو فنا تو ہوئے لیکن یہ فنا ایک بلند تر بقاء کا ذریعہ ہے یعنی اب وہ ایک جاندار کے جسم میں لہو بن کر دوڑنے لگے۔

یہاں تک تو عقلائے زمانہ میں کوئی اختلاف نہیں یعنی جمادات نباتات کی خاطر اور نباتات حیوانات کی خاطر قربان ہوں تو کسی کو اعتراض نہیں مگر اس کے بعد ہے حیوان اور انسان کی منزل۔ یہاں پہنچ کر بعض جماعتوں کو جذبۂ ترحم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ حیوان کی قربانی کو انسان کی خاطر ظلم قرار دیتے ہیں۔

جہاں تک جذبات کا تعلق ہے بلا شبہ یہ رحم کا جذبہ قابلِ قدر ہے بشرطیکہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ جو جانور کی جان لینا پسند نہیں کرتا وہ انسان کی جان لینا کیونکر گوارا کر سکتا ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ اصول جذبات کے پابند نہیں ہوتے۔ یہ سنجیدگی سے طے کرنے کی بات ہے کہ انسان دیگر حیوانات سے بالاتر ہے یا نہیں اور جب کہ یہ بالاتر یقینا ہے تو جمادات نباتات کے کام آئے ظلم نہیں ہوا، نباتات حیوانات کے جزوِ بدن ہوئے ظلم نہیں ہوا تو پھر اگر حیوان انسان کے کام آئے تو کیوں ظلم قرار پائے گا؟

ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ زمین اور درختوں میں احساس نہیں ہے۔ حیوان میں احساس ہے اس لئے یہ ظلم ہے مگر میں کہوں گا کہ کیا ظلم کا معیار احساسِ تکلیف ہے؟ یعنی قاتل مقتول کو اس کے ہوش و حواس کی حالت میں قتل کر دے تو جرم ہوگا اور اگر بیہوشی سونگھا کر اور بے حسی کی حالت میں قتل کرے تو جرم نہ ہوگا؟ یہ قطعاً غلط ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم میں شعور اور بے شعوری کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ظلم کا معیار اقدامِ ناحق ہے۔ وہ اقدامِ ناحق باشعور کے ساتھ ہو تو ظلم ہوگا اور بے شعور کے ساتھ ہو تو ظلم ہوگا۔ لہٰذا اگر پست کا بلند کے کام آنا ظلم ہے تو زمین میں کھیتی کرنا بھی ظلم ہے۔ نباتات سے غذا حاصل کرنا بھی ظلم ہے اور اگر پست کا بلند کے کام آنا ظلم نہیں ہے بلکہ اس کے مقصدِ وجود کی تکمیل ہے تو پھر حیوان کی قربانی کو بھی ظلم نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اسلام اس حیوان کو بھی جس کی قربانی ہو عزّت کی نظر سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ اسے مَیتہ نہیں قرار دیتا یعنی اگر اپنی موت سے مرتا تو وہ میتہ ہوتا لیکن جب اپنے سے بالاتر یعنی انسان کے کام میں آنے کے قابل ہوا تو حالانکہ وہ مر گیا ہے مگر اس کا نام میتہ نہیں بلکہ ذبیحہ ہے اور صرف نام کا فرق نہیں بلکہ احکام کا بھی فرق ہے۔ اگر میتہ ہو تو نجس یعنی زندگی میں وہ جانور پاک تھا مگر اب مرنے سے نجس ہو گیا لیکن اگر ذبیحہ ہے تو پاک ہے اور وہی اجزاء پاک نہیں جو زندگی میں پاک تھے، بلکہ خون متعارف بہنے کے بعد جو خون اجزائے گوشت میں پیوست رہ جائے وہ خون بھی پاک وحلال ہے۔ یہ عزّت ہے اپنے سے مافوق کی خاطر قربان ہونے کی۔ پھر جب کہ حیوان اپنے سے بلند کے کام آئے تو وہ میتہ نہیں ہے تو انسان بھلا جب اپنے سے بلند کے کام آئے تو مردہ ہوگا؟ ناممکن ہے۔ بے شک وہ جسمانی حیثیت سے مر گیا لیکن اگر وہ اپنی موت مرتا تو میّت ہوتا اور جب اس نے اپنے سے بالاتر کی خاطر جان دی تو اب وہ میّت نہیں ہے بلکہ شہید ہے اور فقط نام کی تفریق نہیں بلکہ احکام کا بھی فرق ہے۔ اگر میت ہے تو نجس، یعنی کتنا ہی صاحب اوصاف، بلند مرتبہ انسان ہو مرنے کے بعد اس کا جسم شریعتِ اسلامی کی رو سے نجس قرار پا جاتا ہے۔ اسی نجاست کے دور کرنے کے لئے غسلِ میت قرار دیا گیا ہے۔ جب غسل ہوگا تب جسم پاک ہوگا لیکن اگر شہید ہے تو مرنے کے بعد غسل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں نجاست کا گزر ہوا ہی نہیں بلکہ کفن کی بھی ضرورت نہیں اور لباس سے معرکۂ جنگ میں بہے ہوئے خون کے چھڑانے اور اس کپڑے کو پاک وصاف کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اسی خون بھرے لباس میں دفن کر دینا چاہئے کیونکہ خون مردانِ راہِ خدا کی زینت ہے۔

مگر یہ درجہ جس کا نام شہادت ہے اسی وقت حاصل ہوگا کہ جب اپنے سے بالاتر کی خاطر جان دی جائے، لیکن دنیا والے عموماً جن جن چیزوں کی خاطر جان دیا کرتے ہیں وہ سب پست ہیں۔ مثلاً دولت کے لئے اگر جان دی تو دولت کیا چیز ہے۔ انسان سے کئی درجے پست۔ اصل دولت کا معیار زر ہے یعنی سونا، جس ملک کے پاس سونا زیادہ وہ ملک مالدار۔ یہ کاغذ (نوٹ) تو قیمتی اس وقت ہے کہ جب اس کے بدلے کا سونا محفوظ ہو۔ اب سونا کہ جو اصل دولت ہے وہ حقیقت واصلیت میں کیا چیز ہے؟ جو ٹھوکروں میں آنے والے پتھر ہیں یعنی جمادات۔ جسے قدرت نے ذرا شوخ رنگ کا بنا دیا اسے دنیا لعل و یاقوت و زمرّد کہنے لگی، اسے قیمتی سمجھا جانے لگا، کیونکہ قیمتی ہونے کا معیار اس بازار دنیا میں کسی شئے کا کار آمد ہونا نہیں، بلکہ کمیاب ہونا ہے حالانکہ خالقِ حکیم کے نظامِ فطرت میں جو شئے کمیاب ہے وہ زندگی کے لئے بے کار ہے۔ اس نے جو شئے زیادہ ضروری ہے اتنی ہی زیادہ پیدا کی ہے۔ سب سے زیادہ ضروری چیز زندگی کے لئے ہوا ہے، وہ سب سے زیادہ پیدا کی گئی اور ہر جگہ یہاں تک کہ ہم اگر اس سے بھاگنا بھی چاہیں تو وہ ساتھ نہ چھوڑے گی۔ دوسرے درجہ پر حیات کے لئے ضروری پانی ہے تو وہ پیدا بھی اسی تناسب سے کیا گیا۔ وہ موجود ہر جگہ ہے مگر محتاجِ ذرائع ہے۔ ہوا کے حاصل کرنے کے لئے ڈول، رسّی کی ضرورت نہیں بلکہ خود ہمارے نظامِ حیات میں نفس کی آمد و شد ہی صالح ہوا کے جذب اور فاسد کے دفع کا کام دیتی ہے۔ اس طرح ضرورتِ حیات کی تکمیل کو جزوِ حیات بنا دیا گیا ہے مگر پانی کو حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ سعی و عمل کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر ہوا کے ہم تھوڑی دیر بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن پانی کئی وقت بھی نہ ملے تو زندہ رہ سکتے ہیں۔ تیسرے درجہ پر غذا ہے اس لئے غذا کی خلقت بھی اسی صورت پر ہوئی۔ پانی کے حصول سے زیادہ اس کی پیداوار ذرائع کی محتاج قرار دی گئی۔ جو چیزیں روزمرہ کے ضروریات سے بالکل غیر متعلق اور اس حیثیت سے بے کار تھیں انھیں پہاڑوں کے اندر رکھ دیا۔ سمندر کی تہ میں چھپا دیا۔ مگر یہ انسان کا معیارِ اعتبار ہے کہ وہ جب کوہ کنی اور غوطہ زنی کر کے ان نہفتہ اشیاء کو حاصل کر لیتا ہے تو انہی کو سب سے زیادہ قیمتی قرار دے لیتا ہے اور ضروریاتِ زندگی کی چیزیں اس کے نزدیک کم قیمت ہیں، اس لئے کہ فیاض خالق نے انھیں کثرت کے ساتھ پیدا کر دیا ہے مگر اصلی قیمت کا حال اس وقت کھلتا ہے جب ضروریِ حیات چیز کسی وقت کمیاب ہو جاتی ہے۔ لق و دق صحرا ہو اور خزانہ پاس ہو مگر پانی نایاب ہو اس وقت دیکھنا ہے کہ خزانہ زیادہ قیمتی ہے یا پانی۔ اسی دولت کی خاطر جو حقیقت کے لحاظ سے بے قیمت شئے ہے، انسان جان دے دیتا ہے تو یہ جوہر نفس انسانی کی قربانی اپنے سے تین درجے پست شئے کے لئے ہوئی جو جمادات میں داخل ہے۔ یہ قربانی مقتضائے فطرت کے خلاف ہے کیونکہ سنّتِ کائنات یہ تھی کہ پست بلند کی خاطر قربان ہو اور چونکہ شریعت بمقتضائے فطرت ہوتی ہے اس لئے یہ جان دینا انسان کے لئے جرم ہے۔ اس کا نام ہے ''ہلاکت''۔

اسی طرح کچھ لوگ شہرت کی خاطر جان دیتے ہیں جو کوئی اصلیت رکھنے والی چیز ہی نہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ سلطنت کی خاطر جو بالکل بے اعتباری شئے ہے۔ جب تک لوگ سمجھ رہے ہیں، بادشاہ ہے اور لوگوں نے سمجھنا چھوڑ دیا تو آدمی وہی ہے مگر بادشاہ نہیں رہا۔

اسی طرح وہ جس کے لئے بازاری محاورات میں جان دینے اور مرنے کی لفظ مخصوص ہوگئی ہے یعنی کسی جمالِ فانی کو مقصدِ قربانی بنانا، تو اس سے بقا کیوں کر ملے گی۔ جب مرکزِ قربانی خود فانی ہے تو اس کی خاطر جان دینا تو فنا در فنا ہوگا۔ بقاء اُس وقت مل سکتی تھی جب فنا فی البقاء ہوتی۔

یہ سب خود اپنی قیمت نہ جاننے کا نتیجہ ہے کہ آدمی اپنے کو ایسی پست چیزوں پر قربان کرے۔ اس قربانی کو شہادت نہیں کہہ سکتے یہ عوام کی غلط ذہنیت ہے کہ وہ زمین پر بہتے ہوئے خون اور خاک و خون میں غلطاں لاش کو دیکھ کر شہید سمجھ لیتے ہیں اور اس

کے مدفن کو شہید کا مزار قرار دے لیتے ہیں۔ شہادت کا تعلق مقصد کی بلندی کے ساتھ ہے۔ انسان کو مقصدِ قربانی اپنے سے مافوق قرار دینا لازم ہے۔ اگر وہ پست مقصد کی خاطر جان دے گا تو وہ ہلاکت کا مصداق ہوگا۔ شہادت کا نہیں۔

عالمِ ممکنات میں ہر شئے انسان سے پست ہے۔ اس سے برتر صرف خالقِ کائنات کی ذات ہے، اس لئے اس کی قربانی شہادت اسی وقت ہوگی کہ جب خالق کے ساتھ وابستہ ہو۔ اسی لئے قرآنِ مجید نے حیات جاوید کی نوید دیتے ہوئے صرف قتلو انہیں کہا جس کے معنی یہ ہوتے کہ جو قتل ہو جائیں انھیں مردہ نہ سمجھو بلکہ قید لگائی کہ الذین قتلوا فی سبیل اللہ معلوم ہوا کہ حیاتِ جاودانی اسی وقت ملے گی کہ جب مقصدِ قربانی اللہ کی طرف راجع ہو۔

مگر یہاں ذہن کو ایک دشواری محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ جو بھی کسی دوسرے کے لئے قربان ہوتا ہے تو وہ دوسرا ہوتا ہے محتاج اور مرکزِ آفات۔ جب ہی قربانی کا تصوّر درست ہوتا ہے۔ مثلاً زمین پودوں کے کام آئی تو پودے محتاج تھے۔ وہ ضرورت زمین سے پوری ہوئی۔ پودے حیوانات کے کام آئے۔ حیوانات محتاجِ غذا تھے۔ اگر غذا نہ ملتی تو وہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ پودوں نے اس ضرورت کو پورا کیا اور اسی طرح حیوان کی قربانی انسان کے لئے ہوئی کیونکہ انسان بھی غذا کا محتاج تھا۔ حیوانات و نباتات سے وہ ضرورت پوری ہوئی لہٰذا قربانی کا تصور صحیح ہوا، مگر انسان سے مافوق جو ذات ہے وہ غنی بالذات ہے اور فنا و تغیر سے بری ہے پھر اس کے لئے قربانی کا امکان کس طرح ہے؟

مگر قرآن مجید نے اس مشکل کو ایک لفظ سے حل کیا ہے۔ مقصدِ قربانی کے اظہار کے لئے ارشاد ہوا ہے فی سبیل اللہ ''راہِ خدا میں'' ظاہر ہے کہ راستہ عین منزل نہیں ہوتا۔ راستہ اور ہوتا ہے منزل اور ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصدِ قربانی ذاتِ الٰہی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جو اسے پسند ہیں۔ اُن مقاصد کے لئے جان دی جائے تو شہادت قرار پائے گی اور جو پست مقاصد کے لئے جان دی جائے وہ ہلاکت ہے۔

اسے زیادہ صاف لفظوں میں یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ہلاکت اور شہادت کے مابین دو درجوں کا فرق ہے اس لئے کہ درمیان کی منزل سمجھنا چاہئے فطری موت کو جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص مقصد کی خاطر باختیار جان نہیں دی بلکہ بیمار ہوئے، کوئی اتفاقی حادثہ پیش آیا یا عمرِ طبیعی پوری ہوگئی، مرگئے۔ یہ درمیان کا درجہ ہے بایں معنی کہ اس میں نہ ترقی ہے نہ تنزل، نہ ثواب اور نہ عذاب۔

غلط فہمی نہ ہو، میرا یہ مطلب نہیں کہ اعمال کا ثواب و عذاب نہ ہوگا بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس موت کا کوئی ثواب یا عذاب نہیں، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیوں مرگئے اور نہ یہ کہ بڑا کام کیا مرگئے۔ یعنی نہ ملامت نہ شکریہ۔ یہ تو ہوئی وسط کی منزل، اس کے نیچے ہے ہلاکت، یعنی باختیار پست مقصد کی خاطر جان دینا، اس میں عذاب ہے اور اس کے اوپر ہے شہادت یعنی باختیار بلند مقصد کے لئے جان دینا جس میں حیاتِ جاودانی ہے اور بیش قرار اجر و ثواب۔

اب جس وقت کہ ہلاکت اور شہادت میں اتنا بڑا فرق ہے تو کسی شہید راہِ خدا کے اقداماتِ عملی کے مقابل میں یہ آیت پیش کرنا ہرگز درست نہیں ہے کہ "لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" (یعنی) ''اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔''

یہ سوال کبھی درست نہ ہوگا کہ قرآن میں ہلاکت کی طرف جانے سے روکا (گیا) ہے۔ پھر حضرت امام حسینؑ جانتے تھے کہ کربلا میں کیا ہوگا تو عراق کی طرف کس لئے آئے؟ یا جانتے تھے کہ میدان میں تیرِ ستم کا اندیشہ ہے تو علی اصغرؑ کو کیوں لے گئے؟ یا جانتے تھے کہ آپؑ اور آپ کے تمام ساتھ والے مجاہدین شہید ہو جائیں گے تو اہل حرم کو اپنے ساتھ کیوں لائے؟

یہ سوال بالکل غلط ہے، اس لئے کہ قرآن نے جو روکا ہے وہ ہلاکت کی طرف جانے سے روکا ہے شہادت کی طرف جانے سے نہیں۔ منزلِ شہادت کی طرف جانے والا خطرہ کو سمجھتا ہے اور اگر خطرہ محسوس نہ کرے تو صبر و ثباتِ قدم کی قیمت ہی کیا ہوگی، وہ اتفاقی حادثہ قرار پائے گا مگر وہ نگاہِ فرض شناس کی ترازو میں جان

اور مقصد کی اہمیت کا موازنہ کرتا ہے اور پھر مقصد کو جان کے مقابلہ میں ترجیح دے کر بقدمِ اختیار آگے بڑھتا ہے۔ اس کا نام ہوتا ہے ''شہادت''۔

اب یہ ہمتِ دل اور مقصد کی بلندی کے مراتب ہیں کہ کوئی اپنی ہی جان دے اور کوئی اپنے دل کے ٹکڑوں کو، وابستہ افراد کو اور اپنے سے متعلق ہر عزیز چیز کو مقصد پر نثار کر دے۔

واقعۂ کربلا اس باب میں منفرد نظر آتا ہے، ہر معرکہ میں معین کر کے بتا سکتے ہیں کہ یہ قربانی پیش کی گئی لیکن کربلا میں تو یہ سوچنا ہے کہ کیا چیز نہیں قربان کی گئی۔ یہاں جو بھی شئے کسی شخص کو عزیز ہو سکتی ہے وہ مقصد کی راہ میں نثار کر دی گئی بلکہ حضرت امام حسینؑ نے ایسا انتظام کیا کہ قربانی آپ کی زندگی تک محدود نہ رہے۔ آپ اپنے ساتھ ایک قربانیوں کا لشکر لائے تھے جو عصر کے ہنگام تک جہاد کرتا رہا، اور ایک قربانیوں کا خاموش قافلہ لائے تھے جس کا جہاد عصر کے بعد سے شروع ہوا۔ دنیا والے کہتے تھے کہ آپ جانتے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو کیوں لئے جا رہے ہیں؟ مگر حضرت امام حسینؑ تو اپنی قربانی کو مقصد کی بلندی کے مطابق رکھنا چاہتے تھے۔ آپ محسوس فرماتے تھے کہ اسلامی احساسات پر کتنی شدید غشی چھائی ہوئی ہے اور اس کے لئے کتنے تیز چھینٹے کی ضرورت ہے۔ آپؑ کو دشمنوں کی شقاوت کا بھی صحیح اندازہ تھا اور اس کے نتائج بھی پوری طرح پیش نظر تھے اور اس سب کا لحاظ کرتے ہوئے آپؑ نے اپنی قربانی کے اجزاء مرتب فرمائے تھے جو مقصدِ الٰہی کے تحفظ کے لئے ضروری تھے۔

اب واقعۂ کربلا کی روشنی میں ہلاکت اور شہادت کا فرق بہت صاف محسوس ہو جاتا ہے۔ اُدھر کم از کم تیس ہزار اور اِدھر صرف بہتر یا زیادہ سے زیادہ سوڈیڑھ سو۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ادھر والے بالکل مطمئن تھے نہیں وہ بھی جانیں دے رہے تھے، اُن میں سے ہر فرد کو خطرہ کا احساس تھا، اس لئے کہ اس کے قبل کے بدر و احد اور خندق و خیبر یا پھر جمل و صفین اور نہروان کے تذکرے ابھی دماغوں سے بالکل محو تو نہیں ہوئے تھے اور پھر ماضی قریب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ کوفہ میں تن تنہا مسلمؑ بن عقیلؑ نے جنگ میں وہ کارِ نمایاں انجام دیا کہ محمد بن اشعث کو اپنے ساتھ کافی جمعیت رکھتے ہوئے ابنِ زیاد سے کمک منگانا پڑی اور جب ابن زیاد نے کہا کہ ایک آدمی کے مقابلہ کے لئے اتنی فوج کیا کافی نہیں ہے تو محمد بن اشعث نے جواب دیا کہ کیا مجھے کوفہ کے کسی بنیئے بقال سے مقابلہ کے لئے بھیجا ہے؟ ارے یہ محمدؐ کی تلواروں میں کی ایک تلوار ہے۔ اب دیکھئے کہ کوفہ میں تو صرف ایک تلوار تھی لیکن کربلا میں کم از کم اٹھارہ تلواریں تھیں اور جو انصارِ حسینؑ تھے وہ بھی کوئی معمولی افراد نہ تھے۔ ان کے لئے سردارانِ فوجِ یزید کے یہ الفاظ تھے کہ یہ سب کوفہ کے مخصوص شہسوار ہیں جو ہمارے مقابلہ میں نبرد آزما ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان قلیل افراد کے قدم تو ایک دفعہ بھی پیچھے نہیں ہٹے لیکن تیس ہزار فوج نے کئی مرتبہ میدان چھوڑا۔ اس کے بعد یہ ماننا ضروری ہے کہ ادھر والے بھی جانیں دے رہے تھے لیکن کاہے کے لئے؟ وہ مقصد ان کے سالار (عمر سعد) کے اُس اعلان سے ظاہر ہے جو اس نے تیر چلہ کمان میں جوڑتے ہوئے بلند آواز سے کہا تھا اور فوج والوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ گواہ رہنا کہ پہلا تیر فوجِ حسینی کی طرف میں نے رہا کیا ہے۔ بس واقعۂ کربلا کا پورا پس منظر اس ایک جملہ میں مضمر ہے۔ عمر سعد نے فوج والوں کو گواہ کیا ہے۔ کہاں کے لئے؟ دربارِ حکومت میں گواہی دینے کے لئے۔۔۔ یعنی تمام کارنامہ کا مقصد حکومت وقت کی رضا جوئی اور جائزہ و انعام کی ہوس ہے اب اس راہ میں جو جانیں گئیں اسے ہلاکت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

دوسری طرف حضرت امام حسینؑ نے بھی ایک وقت اپنے عمل پر گواہی چاہی۔ وہ کب؟ جب فرزندِ جوان مرنے کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ بوقتِ رخصتِ علی اکبرؑ حسینؑ نے ہاتھ اٹھائے۔ بارگاہِ الٰہی میں کہا: ''پروردگارا! گواہ رہنا کہ اب وہ جا رہا ہے جو صورت و سیرت، رفتار اور گفتار میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے، جب ہم مشتاقِ زیارتِ رسولؐ ہوتے تھے تو اپنے اِس فرزند کو

دیکھ لیتے تھے۔"

چونکہ عمر سعد کا مقصدِ عمل خود واقعہ کا نگراں نہیں تھا اس لئے دوسروں کی گواہیاں درکار ہوئیں لیکن حسینؑ کا مقصدِ قربانی خود حاضر و ناظر تھا لہٰذا دوسرے کو گواہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ خود اسی کے سامنے اپنی وارداتِ قلب پیش کردی۔

یہ تھی وہ قربانی جو مرکزِ اعلیٰ کی خاطر پیش ہو رہی تھی۔ اس لئے وہ شہادت کا مصداق ہوئی جو حیاتِ جاوید کی ضامن ہے۔

یوں تو اس حیاتِ جاوید اور اس کے بالمقابل فنا کی حقیقت ہی دوسری ہے مگر ظاہری آثار کے اعتبار سے بھی دیکھئے تو کربلا میں ہلاک ہونے والے کتنے تھے، وہ یقیناً شہید ہونے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ تھے کیونکہ کربلا کے مجاہدین میں سے ہر ایک کے ہاتھ سے کئی کئی آدمی قتل ہوئے۔ بعض مجاہدین کے حال میں ہے کہ ضجت الاعداء من کثرۃ القتلی بینھم۔ فوجِ دشمن کثرتِ مقتولین سے چیخ اٹھی۔ مگر ان بے شمار مرنے والوں کا نام و نشان بھی قطعاً موجود نہیں۔ یہ ہے ہلاکت، جس کا نتیجہ حقیقی معنی میں مٹ جانا ہے اور امام حسینؑ کے ساتھ والے قیامت تک کی زندگی رکھتے ہیں یہاں تک کہ چھ مہینے کی جان علی اصغرؑ جو باپ کے ہاتھوں پر شہید ہوگئے، ان کے لئے وہ چھ مہینے کی زندگی اس مصرف میں صرف ہونے کے بعد اس طولانی حیات میں تبدیل ہوگئی جس کی کوئی انتہا ہی نہیں۔

یہ شہید ہونے والے ایسے تھے جنھوں نے مقصد کی بلندی کو دیکھ کر اپنی جانیں باختیار خود نذر کردیں۔ شک کی گنجائش نہیں ہے۔ یقیناً با اختیار۔ اسے یوں ہی دیکھ لیجئے کہ کربلا میں انکارِ بیعت جس وقت بھی اقرار سے بدل جاتا اسی وقت جانیں خطرہ سے محفوظ ہو جاتیں لیکن انکار انتہاء تک رہا۔ بڑوں کا کیا ذکر کسی بچہ تک نے امامؑ سے نہیں کہا کہ بس اب مصائب نہیں اٹھتے۔ اب بیعت کر لیجئے۔

یہاں تک کہ جب امامؑ شہید ہوگئے اور اہل حرم رہ گئے تو ان میں سے کبھی کسی کے ذہن میں بیعت کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ یزید ظلم کرتے کرتے عاجز ہوگیا اور آخر میں جب احساسِ شکست ہوا تو پشیمانی کا اظہار کرنے لگا۔ لیکن حضرت امام حسینؑ کے بعد کسی ان کے یہاں کے غلام یا کنیز یا آج تک ان کے کسی نام لیوا تک کو پشیمانی نہیں ہوئی۔

وہ پشیمانی کیا تھی؟ اپنی موت کا احساس تھا جس میں غلط مقصد میں کوشش کرنے والے کو مبتلا ہونا ہے۔ خواہ وہ کچھ عرصہ تک دنیا میں زندہ رہے تو وہ زندگی بھی اس کی موت ہے اور خواہ اس راستے پر مر جائے تو وہ مرنا بھی ہلاکت ہے جو دائمی ہے اور موت سے بدتر ہے۔

اور کارنامۂ حسینی پر نازش و بالیدگی کا سبب صرف حیات جاودانی کا احساس ہے جو شہادت کے ساتھ وابستہ ہے اور جتنا شہادت کا مرتبہ رفیع ہوگا اتنے ہی زندگی کے نقوش زیادہ نمایاں ہوں گے۔ جیسا کہ شہیدِ کربلا حضرت امام حسینؑ جو سید الشہداؑء تھے ان کی شہادت سے حاصل شدہ زندگی بھی ہر زندگی سے زیادہ درخشاں اور پائدار ہے۔ (محرم ۱۳۹۰ھ)

✿✿✿